© rasailojaraid.com

آرا و افکار

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن☆

قرآن مجید میں قصاص کے احکام

چند غور طلب پہلو ــــ ۲

وَلا تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِیُ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ یُسْرِف فِّیُ الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً (بنی اسرائیل ۱۷/۳۳)

''قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو تو بے شک ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے، ضرور اس کی مدد کی جائے گی''

اس آیت کے آغاز میں وَلا تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِیُ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالحَقِّ کے بیان سے یہ واضح تاثر ملتا ہے کہ مقتول کو خون کے بدلے یا فساد فی الارض کے بجائے کسی اور وجہ سے قتل کیا گیا ہے اور یہ تاثر زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ دیتا ہے کہ قتل، قتلِ حق نہیں، بلکہ قتلِ ناحق ہے۔ لیکن قرآنی اسلوب پکار پکار کر قاری کی توجہ اس جانب مبذول کر رہا ہے کہ بات صرف قتلِ ناحق تک محدود نہیں، بلکہ کافی بڑھی ہوئی ہے۔ اگر وَلا تَقْتُلُواْ النَّفْسَ الَّتِیُ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالحَقِّ کے بعد یہ بیان کر دیا جاتا کہ: ''جو قتل کر دیا جائے تو بے شک ہم نے اس کے ولی کو طاقت دی ہے پس چاہیے کہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے، اس کی ضرور مدد کی جائے گی'' تو قتلِ ناحق کے ابلاغ کی حد تک، بیان میں کسی قسم کی کوئی کمی یا خامی موجود نہیں تھی، لیکن قرآن نے ایسے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک لفظ مَظْلُوماً کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس لفظ کے بغیر قرآنی منشا پوری نہیں ہو رہی تھی، اسی لیے یہ لفظ باقاعدہ برتا گیا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ یہ لفظ اس آیت میں قرآن کی منشا جاننے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رہنے دینا، خواہ کمی کر کے یا زیادتی کر کے، یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ پر نہ رکھنا یا ہٹا دینا۔ اس لیے ظلم کا اطلاق ہر قسم کی زیادتی اور تجاوز پر ہوتا ہے خواہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قبل ظلم کے قرآنی مفاہیم کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ظلم اپنی نوع کے اعتبار سے، نفس پر ظلم سے لے کر خدا کے شریک ٹھہرانے تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ایک بات تقریباً طے ہے کہ ظلم کی کوئی بھی صورت ہو، وہ درحقیقت ظلم علی النفس ہی ہے۔ کیونکہ انسان جب ظلم کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے

☆ شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ۔ inaam1970@yahoo.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ظالم اپنے ظلم کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے کرتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ظلم کی یہ نوعیت واضح کی گئی ہے مثلاً، البقرۃ ۰۲: ۵۴، ۵۷، ۲۳۱/ آل عمران ۰۳: ۱۱۷، ۱۳۵/ النساء ۰۴: ۶۴، ۱۱۰/ الاعراف ۰۷: ۲۳، ۱۶۰، ۱۷۷/ توبہ ۹: ۳۶، ۷۰/ یونس ۱۰: ۴۴/ ھود ۱۱: ۱۰۱/ النحل ۱۶: ۳۳، ۱۱۸/ الکھف ۱۸: ۳۵/ النمل ۲۷: ۴۴/ القصص ۲۸: ۱۶/ العنکبوت ۲۹: ۴۰/ الروم ۳۰: ۰۹/ سبا ۳۴: ۱۹/ الطلاق ۶۵: ۰۱۔

ظلم اپنی اصل میں ظلم علی النفس ہونے کے باوجود، محرکات ونتائج میں تنوع کے اعتبار سے، کئی سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً قصہ آدم وابلیس کے اس پہلو کو ہی لیجیے کہ اللہ رب العزت نے وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (البقرۃ ۰۲: ۳۵) کے بیان میں آدمؑ کو متنبہ کیا ہے کہ حکم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں وہ ظالم قرار پائیں گے، لیکن آدمؑ شیطان کے وسوسے (فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى (طہ ۲۰: ۱۲۰) میں آکر (وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى (طہ ۲۰: ۱۲۱) اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (البقرۃ ۰۲: ۳۵) کے خدائی حکم کی تتبع میں رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی معافی کی درخواست کرتے ہیں (وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا (الاعراف ۰۷: ۲۳)۔ معافی کی درخواست میں تشویش اور خوف کا پہلو نہایت عیاں ہے۔ (لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الاعراف ۰۷: ۲۳) بہر حال! معافی کی یہ التجا ظاہر کرتی ہے کہ آدمؑ نے نافرمانی یا پھسلاہٹ کا مظاہرہ، خدائی حکم کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کے لیے نہیں کیا، ورنہ وہ لازماً متکبرانہ انداز اختیار کرتے اور اکڑتے پھرتے، بلکہ اس کے برعکس ان کی التجا ایک لحاظ سے گواہ بن جاتی ہے کہ ان کی نافرمانی کے پیچھے (جس کی وجہ سے وہ ظالمین میں شامل ہو گئے ہیں)، کوئی ایسا محرک ہے جس نے ان سے نافرمانی کراتے ہوئے بھی، انہیں اس اخلاقی سطح پر قائم ودائم رکھا ہے کہ وہ اکڑنے کے بجائے مغفرت وبخشش کے طلب گار ہوئے ہیں۔ قرآن کے مطابق وہ محرک، بھول نسیان ہے (وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً (طہ ۲۰: ۱۱۵)۔ اس لیے انہیں معاف کر دیا جاتا ہے (فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرۃ ۰۲: ۳۷)۔ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر بھی، اسی نوعیت کے بھول چوک والے ظالم کو مغفرت کی بشارت دی گئی ہے، مثلاً:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلاَّ لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُواْ أَنفُسَهُمْ جَآؤُوكَ فَاسْتَغْفَرُواْ اللّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُواْ اللّهَ تَوَّاباً رَّحِيماً (النساء ۰۴: ۶۴)

''اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تمہارے حضور حاضر ہوں پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول بھی ان کے لیے اللہ سے معافی چاہے، تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں''

وَمَن يَعْمَلْ سُوءاً أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّهَ يَجِدِ اللّهَ غَفُوراً رَّحِيماً (النساء ۰۴: ۱۱۰)

''اور جو کوئی برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشش چاہے تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زیرنظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) میں ظلم، اسی نوعیت کا ہے؟ اس کا بدیہی جواب یہ ہے کہ ظالم (قاتل) کی نہ تو کسی بھول کا بیان ہوا ہے اور نہ ہی توبہ استغفار کا کوئی ذکر کیا گیا ہے، اس لیے اسے ظلم کی مذکورہ نوع میں شامل کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ظلم اگرچہ آغاز کے اعتبار سے، ظلم علی النفس ہی ہے، لیکن محرکات ونتائج اسے نہایت سنگین بنا دیتے ہیں۔ ظلم کی انتہائی سنگین نوع سے شناسائی بھی قصہ آدم وابلیس سے ہو جاتی ہے :

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا (الکہف ۱۸:۵۰)

''اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، قوم جن سے تھا، تو اپنے رب کے حکم سے نکل گیا، بھلا کیا اسے اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو، اور وہ تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کو کیا ہی برا بدل ملا''۔

ایک اور مقام پر اس کی وضاحت إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (لقمان ۳۱:۱۳) کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ ظلم کے حوالے سے ہی سورۃ المائدۃ (آیات ۲۷ تا ۳۱) میں آدمؑ کے بیٹوں میں سے ایک کے دوسرے کو قتل کر دینے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس قصے کے ظالم بھائی کی ندامت کو، جو غالباً لاش چھپانے سے لاعلمی پر مبنی ہے، بڑھا چڑھا کر بھائی کے قتل تک بھی پھیلا لیا جائے تو یہ ندامت فرعون کے اس ناقابلِ قبول ایمان کے مانند معلوم ہوتی ہے جو وہ ڈوبتے وقت لے آیا تھا۔ مقتول بھائی نے یہ کہہ کر کہ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اٹھاؤ میرا بھی گناہ اور اپنا بھی گناہ، تو ہو جاؤ گے اہلِ دوزخ میں سے، اور یہ سزا ہے ظالموں کی''، قتل پر آمادہ بھائی کے انجام کے ساتھ ساتھ اپنے قتل کی نوعیت کی بھی نشاندہی کر دی ہے کہ وہ مظلوم مقتول ہے۔ ''تو اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کی جان لینے پر رغبت دلائی، تو اسے قتل کر دیا، اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا'' کا بیان آدمؑ کے مقتول بیٹے کا بیان نہیں، بلکہ الٰہی حکم ہے، جس میں کسی ابہام کے بغیر نہایت صراحت سے ظالم بھائی کو خاسر قرار دیا گیا ہے۔ قصہ آدم وابلیس میں، آدمؑ کی تشویش کا ذکر ہوا تھا کہ ظالم ہونے کے ناطے، انہیں خاسر قرار دیے جانے کا ڈر تھا : لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الاعراف ۰۷:۲۳)۔ لیکن ان کے ظلم کے محرک اور ظلم کی نوعیت نے انہیں خاسر ہونے سے بچا لیا تھا۔ آدمؑ کے ظلم کی نوعیت، کسی دوسرے شخص کی حق تلفی یا اس سے بھی بڑھ کر جان لینے کی حد تک نہیں بڑھی، بلکہ نسیان کے سبب، حکمِ الٰہی کی نافرمانی تک محدود ہے۔ لیکن آدمؑ کے بیٹوں کے قصے میں حکمِ الٰہی کی صریحاً نافرمانی تو ہے ہی، اس کے علاوہ ظلم اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی دوسرے شخص کی حق تلفی سے بڑھتا ہوا اس کی جان لینے کی انتہائی حد تک جا پہنچا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زیرنظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) کے مظلوم کا قاتل، آدمؑ کے ظالم بیٹے سے مماثل ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہر دو جگہ تقریباً یکسانیت پائی جاتی ہے۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قتل، ظالمانہ ہے اور ظلم، کسی دوسرے کی جان لینے کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ 'مَظْلُومًا' بہت ٹھوس انداز میں مقتول کی مظلومیت کی شہادت دے رہا ہے کہ صرف قتلِ ناحق ہی وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ ایسا ظلم رونما ہوا ہے جس میں مقتول نے قاتل کو کسی قسم کا اشتعال نہیں دلایا اور قاتل نے تقریباً یک طرفہ طور پر انتہائی ظالمانہ انداز میں قتل کا ارتکاب کیا ہے جیسا کہ آدمؑ کے مقتول بیٹے کے بیان سے بھی واضح ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے ''اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا کہ مجھے قتل کرو تو میں اپنا ہاتھ تمہاری طرف تمہیں قتل کرنے کے لیے نہیں بڑھاؤں گا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔ لہٰذا ہر دو مقامات پر قاتل کوئی ایسا جواز پیش کرنے سے قاصر ہے جس کی وجہ سے مقتول کو بھی ایک درجے میں ذمہ دار ٹھہرا کر قاتل کے لیے نرمی کی کوئی گنجایش نکالی جا سکے، اس لیے بنی اسرائیل ۱۷:۳۳ کے مظلوم کا قاتل بھی، آدمؑ کے مقتول بیٹے کے اس قول کا مصداق ہے ''میں چاہتا ہوں کہ تم اٹھاؤ میرا بھی گناہ اور اپنا بھی گناہ، تو ہو جاؤ گے اہلِ دوزخ میں سے، اور یہ سزا ہے ظالموں کی''۔ اور اس امر میں بھی شک کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ مظلوم کے قاتل پر حکمِ الٰہی ''اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا'' کا بھی اطلاق ہوتا ہے، اسی لیے یہاں معافی و خون بہا کا سرے سے بیان ہی موجود نہیں۔ المختصر! زیرِ نظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) میں، ظلم کی نوعیت و معنویت، قتل کے ساتھ منسلک ہے۔ قرآن میں قتل کی انواع کا بھی بیان ہوا ہے اور قتلِ خطا و قتلِ عمد کا باقاعدہ ذکر کیا گیا ہے (النساء۰۴: ۹۲، ۹۳) لیکن زیرِ نظر آیت میں قُتِلَ مَظۡلُوماً کے الفاظ، قتل و ظلم کے معنوی حدود اربع کے فہم کے لیے، آدمؑ کے بیٹوں کے قصے سے استفادہ کر رہے ہیں۔

مَظۡلُوماً اور آیت کا تکمیلی لفظ مَنۡصُوراً پورے قرآن میں غالباً اسی مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کا ایک ہی مقام پر خاص انتخاب، دونوں میں کسی گہرے داخلی تعلق کی غمازی کرتا ہے۔ اس تعلق سے جنم لینے والی معنویت، چھپائے نہیں چھپتی۔ مظلوم کی مدد کا یہ بیان بھی دیکھیے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمۡ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصۡرِهِمۡ لَقَدِيرٌ (الحج ۲۲:۳۹)

''اجازت دی جاتی ہے انہیں جن سے جنگ کی جا رہی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد پر قادر ہے''

ان دونوں الفاظ (ظلم، نصر) کے قرآنی محلات، باہمی تعلق پر مبنی معنویت مزید واضح کرتے ہیں۔ قرآن نے نہایت صراحت سے بیان کیا ہے کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مظلوم کا کوئی مددگار رہتا ہے:

فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ (فاطر ۳۵:۳۷)

''تو اب چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں''

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ (الحج ۲۲:۷۱)

''اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''

وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُم مِّن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (الشوری ۴۲/۰۸)

''اور ظالموں کا نہ کوئی ولی اور نہ مددگار''

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهۡوَاءهُم بِغَيۡرِ عِلۡمٍ فَمَن يَهۡدِي مَنۡ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ (الروم ۳۰:۲۹)

''بلکہ ان ظالموں نے بغیر علم کے اپنے خیالات کا اتباع کر رکھا ہے، سو اسے کون راہ پر لائے جسے خدا گم راہ کرے، اور ان کا کوئی مددگار نہیں''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیر نظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷/۳۳) میں قصاص کے بجائے 'سُلْطَاناً' کا استعمال غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ غالباً یہ مقتول کا مظلوم ہونا ہے جس کی وجہ سے یہ لفظ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، مقتول کے مظلومانہ قتل کے پیش نظر اس کے ولی کی ذہنی حالت اور نفسیاتی کیفیت کا لحاظ رکھنے کے سلسلے میں یہ لفظ یہاں وارد ہوا ہے۔ ہماری رائے میں 'سُلْطَاناً' کا آیت کے تکمیلی لفظ 'مَنْصُوراً' کے ساتھ گہرا داخلی ربط قائم ہے، اس ربط کی ایک نظیر قرآن میں ایسی صراحت سے سامنے آئی ہے جس سے زیر نظر آیت میں اس ربط کی معنویت وحکمت پوری شان کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے:

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَاناً نَّصِيراً (بنی اسرائیل ۱۷:۸۰)

''اور کہہ اے میرے رب داخل کر مجھ کو داخل کرنا سچا اور نکال مجھ کو نکالنا سچا، اور مجھے اپنی طرف سے مددگار غلبہ (سُلْطَاناً نَّصِيراً) دے''

مقتول کی مظلومیت اور اس کے ولی کو سلطان بنانے کا بیان، اس لحاظ سے اہم ہے کہ سلطان اور ظالم کے قرآنی اطلاقات، ایک دوسرے کے تقریباً مقابل کھڑے نظر آتے ہیں:

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُواْ الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ (آل عمران ۰۳:۱۵۱)

''ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرایا جس پر کوئی دلیل (سُلْطَاناً) اس نے نہیں اتاری ہے اور جگہ ان کی آگ ہے اور کیا برا ٹھکانہ ہے ظالموں کا''

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الأَمْرُ إِنَّ اللّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدتُّكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلاَّ أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلاَ تَلُومُونِي وَلُومُواْ أَنفُسَكُم مَّا أَنَاْ بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِن قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ابراہیم ۱۴:۲۲)

''اور شیطان کہے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچے وعدے کیے تھے اور میں بھی کچھ وعدے کیے تھے سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کیے تھے اور میرا تم پر اور تو کچھ زور (سُلْطَان) نہ چلتا تھا بجز اس کے کہ میں نے تم کو بلایا تھا سو تم نے میرا کہنا مان لیا تو تم مجھ پر ملامت مت کرو اور ملامت اپنے آپ کو کرو، نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکو، وہ جو تم نے پہلے مجھے شریک ٹھہرایا تھا میں اس سے سخت بیزار ہوں، بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے''

هَؤُلَاء قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِباً (الکہف ۱۸:۱۵)

''یہ جو ہماری قوم ہے اس نے اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھے ہیں، کیوں نہیں لاتے ان پر کوئی روشن سند (بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۳۳ میں مظلوم مقتول کے ولی کو (سُلْطَاناً) بنانے کا بیان خاص حکمت کا حامل ہے۔ اگر ولی کو صرف طاقت وزور دینا مقصود ہوتا تو کسی اور لفظ کے ذریعے بھی ادائیگی ہو سکتی تھی۔ اس لیے معنوی سطح پر سُلْطَاناً، ایک طرف (مَظْلُوماً) کے ساتھ اور دوسری طرف (مَنصُوراً) کے ساتھ، گہرا داخلی تعلق رکھتا ہے۔ ذرا مختلف زاویے سے، اس تعلق کی ایک مثال یہ آیت ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً وَمَا لَيْسَ لَهُم بِهِ عِلْمٌ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ (الحج ۲۲:۷۱)

''اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اس کی جس کے لیے اللہ نے کوئی دلیل (سُلْطَاناً) نہیں اتاری اور نہ اس کے متعلق انہیں کچھ علم ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''

اندریں صورت، قرآنی منشا کی تلاش میں '' سُلْطَاناً'' کے قرآنی مفاہیم تک رسائی بہت ضروری ہو جاتی ہے:

أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُواْ لِلّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيناً (النساء۰۴:۱۴۴)

''کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کے لیے صریح حجت (سُلْطَاناً مُّبِيناً) کر لو''

اس آیت کا استفہامیہ انداز بتاتا ہے کہ سلطان، صفاتِ الٰہیہ میں سے نہیں ہے، لیکن چونکہ استفہام کے ایک سرے پر خدا موجود ہے اور اسی کے لیے (سُلْطَاناً مُّبِيناً) استعمال ہوا ہے، اس لیے (سُلْطَاناً) کی معنویت کی بابت یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ کسی قسم کی بے انصافی اور اخلاق باختگی اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔ حضرت سلیمانؑ بھی جب ہدہد کو غیر حاضر پاتے ہیں تو فرماتے ہیں:

لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَاباً شَدِيداً أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (النمل ۲۷:۲۱)

''ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا یا ذبح کر دوں گا یا کوئی صاف حجت (بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ) میرے پاس لائے''

مذکورہ دو آیات (النساء۴:۱۴۴/ النمل ۲۷:۲۱) کے تقابلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سلطان'' ساختیاتی اعتبار سے کسی ایسے جواز پر دلالت کرتا ہے، جس کے بعد مزید حیل وحجت کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ البتہ، طرفین کے مقام اور موقع محل کی نسبت سے، جواز کی نوعیت اور درجے میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں مختلف مواقع پر ''سلطان'' کا جس طرح بیان ہوا ہے اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر قسم کی آلایشوں سے پاک جواز اور صریح حجت، عطیہ خداوندی ہے۔ اس لیے جب رسولوں سے ''سلطان'' کا تقاضا کیا گیا:

فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (ابراہیم ۱۴:۱۰)

''اب کوئی روشن سند (بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ) ہمارے پاس لے آؤ''

تو انہوں نے جواب دیا:

وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلاَّ بِإِذْنِ اللّهِ (ابراہیم ۱۴:۱۱)

''اور ہمارے اختیار کی بات نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تم کو دلیل (بِسُلْطَانٍ) دکھائیں''

ایک مقام پر، سلطان کی استثنائی حیثیت کے ساتھ، جن وانس کو چیلنج کیا گیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ (الرحمٰن ۵۵:۳۳)

''اے جن وانس کے گروہ اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، مگر بدون زور (بِسُلْطَانٍ) کے نہیں نکل سکتے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن وانس، سلطان کے ساتھ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہیں، اور سلطان (وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّهِ (ابراہیم ۱۴:۱۱) کے مصداق، عطیہ خداوندی ہے۔ بعض مقامات پر تو قرآن نے طنز کی آمیزش کے ساتھ باقاعدہ چیلنج کیا ہے کہ تمہارے پاس ''سلطان'' ہو ہی نہیں سکتا:

أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (الطّور ۵۲:۳۸)

''یا ان کے پاس کوئی زینہ ہے جس میں چڑھ کر سن لیتے ہیں تو ان کا سننے والا کوئی روشن سند (بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ) لائے''۔

إِنْ عِندَكُم مِّن سُلْطَانٍ بِهَـذَا (یونس ۱۰:۶۸)

''تمہارے پاس اس کی کوئی بھی سند (سُلْطَانٍ) نہیں''

اسی لیے قرآنی اطلاقات میں، کہیں بھی شیطان کو حقیقی معنوں میں ''سلطان'' حاصل نہیں:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلاً (بنی اسرائیل ۱۷:۶۵)

''بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کچھ قابو (سُلْطَانٌ) نہیں، اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے کو''

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ وَرَبُّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (سبا ۳۴:۲۱)

''اور شیطان کا ان پر کچھ قابو (سُلْطَانٍ) نہ تھا مگر اس لیے کہ ہم دکھا دیں کہ کون آخرت پر ایمان لاتا ہے اور کون اس سے شک میں ہے اور تمہارا رب ہر چیز پر نگہبان ہے''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کو سلطان اس لیے ہی حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس کا مستحق ہے بلکہ اس کے ذریعے دوسروں کی آزمایش مقصود ہوتی ہے، اس لیے سلطان کا حامل حقیقی معنوں میں سلطان کا حامل نہیں بھی ہو سکتا۔ اس نکتے کی مزید وضاحت سورۃ النحل کی ان آیات سے ہوتی ہے:

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ (النحل ۹۹،۱۰۰)

''بے شک اس کا کوئی قابو (سُلْطَانٌ) ان پر نہیں جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ اس کا قابو (سُلْطَانُهُ) انہیں پر ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور اسے شریک ٹھہراتے ہیں''

غور کیجیے کہ طرفین (انسان اور شیطان) میں سے انسان جس مقام پر کھڑا ہوتا ہے اسی سے سلطان کی نوعیت اور وقوع پذیری میں فوری تبدیلی آجاتی ہے۔ سورۃ النحل ۱۶ آیت ۱۰۰ کے مطابق، چونکہ انسان (پورے قرآنی سیاق میں) کذب وظلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مرتکب ہو کر شیطان کو شریک ٹھہراتا ہے، جو توحید کے مقابل جعل سازی ہے اس لیے شیطان کو بھی ایسے انسان پر جعلی سلطان حاصل ہو جاتا ہے۔ بہرحال! سورۃ سبا اور سورۃ النحل کی مذکورہ آیات کو دیکھیے اور غور کیجیے کہ سلطان کے ساتھ، آخرت، توکل، اور توحید جیسے اہم قرآنی تصورات وابستہ ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر، لوگوں کے شرک کرنے اور دیگر اخلاقی امراض میں مبتلا ہونے پر، یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا اللہ نے ان کو (ان امور کے لیے کوئی جواز) سلطان عطا کیا ہے؟:

أَمْ أَنزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَاناً فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ (الروم۳۰:۳۵)

''کیا ہم نے ان پر کوئی سند (سُلْطَاناً) نازل کی ہے کہ وہ ان کو شرک کرنے کو کہہ رہی ہے''

وَأَن تُشْرِكُواْ بِاللّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً (الاعراف۷:۳۳)

''اور یہ کہ تم شریک بناؤ اللہ کا ان کو کہ نہیں نازل کی اللہ نے ان کے بارے میں کوئی سند (سُلْطَاناً)''

مزید دیکھیے: الانعام۶:۸۱/الاعراف۷:۷۱/غافر۴۰:۳۵۔

سلطان، قرآن مجید میں کئی مقامات پر اللہ کی طرف سے، حجت، سند، دلیل، اختیار اور غلبہ وغیرہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے:

وَأُوْلَـئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَاناً مُّبِيناً (النساء۴:۹۱)

''اور یہ ہیں جن پر ہم نے تمہیں صریح اختیار (سُلْطَاناً مُّبِيناً) دیا ہے۔''

وَآتَيْنَا مُوسَى سُلْطَاناً مُّبِيناً (النساء۴:۱۵۳)

''اور موسیٰ کو صریح غلبہ (سُلْطَاناً مُّبِيناً) دیا''

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَاناً (القصص۲۸:۳۵)

''اور تم دونوں کو شوکت (سُلْطَاناً) عطا فرمائیں گے''

وَأَنْ لَّا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ إِنِّي آتِيكُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (الدخان۴۴:۱۹)

''اور اللہ کے مقابل سرکشی نہ کرو میں تمہارے پاس ایک روشن سند (بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ) لاتا ہوں''

وَفِي مُوسَى إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَى فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ (الذاریات۵۱:۳۸)

''اور موسیٰ میں جب ہم نے اسے روشن سند (بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ) کے ساتھ فرعون پاس بھیجا''

سلطان کے مذکورہ مفاہیم، اس کی متنوع معنویت کی بابت داخلی شہادت فراہم کر رہے ہیں۔ اگر ان آیات کو تفصیل سے دیکھا جائے جہاں اللہ نے رسولوں کو سلطان عطا فرمایا ہے تو یہ اہم نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس اتمام حجت اور عطیہ خداوندی کے بعد حکم عدولی کی صورت میں متعلقہ قومیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ اب زیر نظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) کے اس حصے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً) پر غور کیجیے کہ ولی کو آخر سلطان ہی کیوں بنایا گیا ہے؟۔ اگر ولی کو اختیار، طاقت یا زور دینا مقصود تھا تو کسی اور لفظ سے مدعا ادا ہو سکتا تھا، اور اگر مقصود، دلیل و حجت یا سند دینا تھا تو اس کے لیے بھی ایسا لفظ برتا جا سکتا تھا جو اسی مفہوم کو قطعیت کے ساتھ ادا کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس آیت میں (سُلْطَاناً) کا بیان، معنوی سطح پر کم از کم دو سمتوں میں پھیلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے۔ اگر ایک سمت میں ولی کو ایسا اختیار، جواز اور زور ملتا نظر آتا ہے جس کے پیچھے خدائی سند موجود ہے تو دوسری سمت میں معاشرے کے لیے انذار کا اہتمام موجود ہے کہ مظلوم مقتول کے ولی کو جب اللہ رب العزت نے سُلْطَاناً بنا دیا تو پھر اس کے بعد حکم عدولی کی صورت میں، تباہی و بربادی اس معاشرے کا مقدر ہوگی۔ اگر سُلْطَاناً اور آیت کے تکمیلی لفظ مَنْصُوراً کے باہمی داخلی ربط پر نظر رکھی جائے تو ولی کے لیے بشارت اور معاشرے کے لیے انذار کی مذکور معنویت مزید اجاگر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں مقتول کی مظلومیت کی وجہ سے ولی کو سُلْطَاناً بنانے کا بیان، ایک اعتبار سے رسولوں کو سُلْطَاناً عطا کرنے کے مماثل ہے، جس کے انکار کا نتیجہ بربادی ہی بربادی ہے۔

بنی اسرائیل ۱۷:۳۳ کے اس حصے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً) کا، البقرۃ ۰۲:۱۷۸ کے اس حصے (فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ) سے تقابل و موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقام پر مقتول کے وارث کو بھائی کہا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ولی۔ اب اگر قاتل کو معاملہ طے کرنا ہو تو، جس مقتول کے وارث کو بھائی کہا جا رہا ہے، اس کے ساتھ معاملہ طے کرنے میں اسے آسانی ہوگی یا اس کے ساتھ، جسے مقتول کا ولی قرار دیا جا رہا ہے؟ ۔ظاہر ہے قاتل کے لیے بھائی کے بجائے ولی کا فی روکھا اور سرد لفظ معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور زاویے سے دیکھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ (لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً) کے بیان میں ولی کو ایسی زبردست طاقت و جواز دینے کا اہتمام پایا جاتا ہے جس کے بعد کسی دلیل یا حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، جبکہ أَخِيهِ کے بیان میں ولی کے حوالے سے، اخوت و الفت جیسی جملہ خصوصیات سموئی گئی ہیں۔ اسی طرح فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً میں ولی، کسی سمجھوتے کے بجائے طاقت و جواز کا جھنڈا لہراتا نظر آتا ہے جبکہ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ کے بیان میں مقتول کا وارث معافی کی درخواست ایک حد تک قبول کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ہر دو مقامات پر مخصوص الفاظ کا انتخاب، قتل کی مختلف انواع کی غمازی کرتا ہے۔ یعنی جواز کے تحت قتل اور ظالمانہ قتل، اگرچہ دونوں قتلِ ناحق کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل آیت ۳۳ میں مقتول کو باقاعدہ مظلوم گردا ننا اور اس کے ولی کا طاقت (سُلْطَانا) مکمل اختیار رکھنا، قتلِ ناحق کی شدید صورت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاید اسی لیے اس آیت میں معافی و خون بہا کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ ظاہر ہے ایسے اعصاب شکن اور انتہائی تناؤ والے ماحول میں ولی کو اسراف فی القتل سے روکنا ہی بڑی بات ہے چہ جائے کہ اس سے معافی کی توقع رکھی جائے۔

بنی اسرائیل ۱۷ کی زیرِ نظر آیت ۳۳ میں سُلْطَانا کی موجودگی اور دیت، عفو اور صدقے جیسے الفاظ کی عدم موجودگی اس تاثر کو مزید تقویت دیتی ہے کہ قاتل کو کسی بھی قیمت پر ہرگز نہ چھوڑا جائے۔ ظاہر ہے ظالم قاتل سے کسی کو بھی ہمدردی نہیں ہوگی اور زبان خلق پکار پکار کر کہے گی کہ اسے بالکل نہ چھوڑا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے مطابق کسی شخص کا مظلومانہ قتل، کسی بھی معاشرے کے اجتماعی اخلاقی ضمیر کے لیے ناقابل برداشت اور ناقابلِ ہضم ہونا چاہیے۔ مقتول کے ولی کی طاقت و معاونت کے پیچھے درحقیقت یہی ضمیر کارفرما ہے۔

جہاں تک قتل کے فعل میں، اسراف کی ممانعت کا تعلق ہے اس سلسلے میں ''اسراف'' کے قرآنی اطلاقات راہنمائی فراہم کرتے ہیں، جن سے صراحت ہوتی ہے کہ قتل کے فعل میں ''غلو'' سے روکا گیا ہے، مثلاً: (النساء ۰۴:۰۶/ الانعام ۰۶:۱۴۱/ الاعراف ۰۷:۳۱)۔ قرآن میں ایک مقام پر اسراف کے مقابل دوسری انتہا کا ذکر کر کے مطلوب و مقصود ''توازن'' کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نشاندہی کردی گئی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَاماً (الفرقان ۲۵/ ۶۷)

''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں نہ حد سے بڑھیں اور نہ تنگی کریں اور ان دونوں کے درمیان اعتدال پر رہیں''

اگر بنی اسرائیل آیت ۳۳ کے بیان (فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ) میں، دوسری انتہا (وَلَمْ يَقْتُرُوا) کو بوجوہ، شامل سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حدِ اعتدال، معروف کے مطابق قتل ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مظلوم مقتول کے بدلے میں قتل نہ کرنا بھی قرآنی منشا کے منافی ہے، شاید اسی لیے یہاں معافی و خون بہا کو کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ قرآن میں ایک مقام پر اسراف کی معنویت، زیرِ نظر آیت میں اسراف کی ممانعت کو قتل کرنے کے طریقہ کار تک بڑھا دیتی ہے :

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ (الاعراف ۰۷/ ۸۱)

''تم تو مردوں کے پاس شہوت سے جاتے ہو عورتیں چھوڑ کر، بلکہ تم قوم ہو حد سے نکل جانے والے''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولی پر لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرنے کے عمل میں، خلافِ فطرت، خلافِ وضع یا معروف کے خلاف، کوئی شرم ناک طریقہ نہیں اپنائے گا۔ اس لیے (فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ) کے بعد (إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً) کے الفاظ داخلی شہادت دے رہے ہیں کہ ولی کو کسی ایسے منفی اقدام سے روک کر اس کی مدد کی جائے گی۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس مدد کرنے کے بیان میں، ولی کو ایک خاص درجے میں متنبہ کیا گیا ہے، لیکن یہ تنبیہ اتنے لطیف کنایے میں ہے کہ ولی پر گراں نہیں گزرتی۔ ظاہر ہے کہ تنبیہ پر مشتمل یہ مدد، ریاستی نظم کے ذریعے سے ہی ممکن ہو سکے گی جس کے پیچھے اجتماعی معاشرتی ضمیر لازماً موجود ہوگا۔ قرآن میں اسراف کا بیان، اللہ سے لاتعلقی و بے نیازی کے معنی میں بھی آیا ہے:

وَإِذَا مَسَّ الإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِداً أَوْ قَآئِماً فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرٍّ مَّسَّهُ كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (یونس ۱۰/ ۱۲)

''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے ہمیں پکارتا ہے لیٹے اور بیٹھے اور کھڑے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا چلتا ہوتا ہے گویا کبھی کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح مسرفین کے لیے آراستہ ہوا وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے''

گویا زیرِ نظر آیت (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳) میں یہ معنویت بھی موجود ہے کہ اگرچہ مظلوم مقتول کا ولی مشکل حالات میں اللہ کو پکارتا ہے اور اللہ اس کو ''سلطان'' بنا دیتا ہے، لیکن جب قاتل اس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو وہ خود کو حق بجانب خیال کرتے ہوئے ظالم قاتل کو انتہائی برے انداز میں قتل کر کے، اپنے تئیں عین فطرت کے مطابق حق کام سرانجام دینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کا مظلومانہ قتل ایسی صورتِ حال کو جنم دے سکتا ہے جس میں مقتول کا ولی بھڑک کر اسراف فی القتل کا نہ صرف مرتکب ہو سکتا ہے بلکہ اپنے عمل کو حق بجانب بھی خیال کر سکتا ہے۔ اس لیے ایسے قتل کی مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر ہی اس آیت میں ''قصاص'' کے بجائے اسراف فی القتل کی ممانعت کر کے حقیقت میں قصاص کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم میں مضمر ممانعت کے اندر ہی نہایت لطیف انداز میں ولی کو اسراف سے وابستہ، آراستگی و زینت پر متنبہ بھی کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق مسرفین، اسراف کو اس وقت مزین و آراستہ دیکھتے ہیں جب وہ اللہ سے لاتعلقی و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے نیازی کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اس لیے مسرف کو آیاتِ الٰہی اور خدائی احکامات کا منکر قرار دیا گیا ہے، دیکھیے : یونس ۱۰:۸۳/ طٰہٰ ۲۰:۱۲۷/ الانبیاء ۲۱:۰۹/ غافر ۴۰: ۲۸، ۳۴، ۴۳/ الزخرف ۴۳:۰۵/ الدخان ۴۴:۳۱/ الذاریات ۵۱:۳۴۔ اس استشہاد سے، مذکورہ لطیف تنبیہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا نفسیاتی اور اخلاقی لحاظ سے، ولی کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہنا چاہیے کہ اسراف فی القتل کا عمل اسے آیاتِ الٰہی کے منکرین میں شامل کر سکتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں چونکہ مقتول، مظلوم ہے اس لیے معاشرے کی اس کے ساتھ فطری ہمدردی اور اس کے ولی کی ذہنی حالت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، اسراف فی القتل کی ممانعت کے حکم کے باوجود، اسراف ہو جانے کی صورت میں لچک کا پہلو رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ قرآن مجید میں اسراف کی جو معنوی پرتیں پائی جاتی ہیں ان میں اسراف کے محرکات ونتائج کو کافی اہمیت دی گئی ہے، مثلاً: ''اور مت مانو حکم مسرفین کا، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور نہیں اصلاح کرتے'' (الشعراء ۲۶/۱۵۱، ۱۵۲) لیکن جہاں کہیں انسان ضد اور ہٹ دھرمی کے بجائے بے اختیاری و مجبوری میں اسراف کا ارتکاب کرتا ہے، وہاں اللہ رب العزت نے بخشش ورحمت کی بھرپور امید دلائی ہے:

> وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلاَّ أَن قَالُواْ ربَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (آل عمران ۰۳/۱۴۷)
>
> ''اور وہ کچھ بھی نہ کہتے تھے سوائے اس دعا کے کہ اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں ہم نے اپنے کام میں کیں اور ہمارے قدم جما دے اور مدد دے ہم کو اوپر قوم کافروں کے''
>
> قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيْعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيْمُ (الزمر ۳۹/۵۳)
>
> ''تم فرماؤ اے میرے وہ بندو اجنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے''

چونکہ مظلوم مقتول کا ولی اسراف کرنے کی صورت میں، بے اختیاری کی کیفیت میں اسراف کرتا ہے، اس لیے وہ جان بوجھ کر ایک خاص باغی ذہن کے ساتھ آیاتِ الٰہی اور منشائے ربانی کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اب چونکہ ولی، ذہنی حالت کے لحاظ سے خدا کا باغی نہیں ہے اس لیے اسراف ہو جانے کی صورت میں اسے مغفرت ورحمت کی امید لازماً رکھنی چاہیے۔ زیرِ نظر آیت کے تکمیلی الفاظ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً سے اس نکتے کی مزید تصریح ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں اسراف کی ممانعت کی آیات کا خاتمہ وَلَا تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الانعام ۰۶/۱۴۱، الاعراف ۰۷/۳۱) کے الفاظ میں کیا گیا ہے، لہٰذا اسراف کی صورت میں، اگر ولی کے لیے لچک کی گنجایش مقصود نہ ہوتی تو اس آیت کے اختتام پر بھی إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً کے بجائے إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ کے الفاظ پائے جاتے۔ لہٰذا إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوراً کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ قرآن نے مقتول کی مظلومیت اور ولی کی ذہنی حالت کا پورا خیال رکھا ہے۔ اگر إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ کے الفاظ برتے جاتے تو مقتول کی مظلومیت اور ولی کی ذہنی حالت دھیان میں نہیں رہ سکتی تھی، اس پر مستزاد یہ تاثر ملتا کہ قرآن، قاتل کو (ظالم ہونے کے باوجود) کسی نہ کسی حوالے سے کوئی تحفظ دینا چاہتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسراف کے محرکات ونتائج کے حوالے سے، بنی اسرائیل ۱۷/۱/آیت ۳۳ کا تقابل المائدۃ ۳۲/۰۵ سے کیا جائے تو اس مسرف کو چہرہ سامنے آتا ہے جو قرآن کی نظر میں معتوب ہے:

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِيْ إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً وَلَقَدْ جَاءتْهُمْ رُسُلُنَا بِالبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيْراً مِّنْهُم بَعْدَ ذَلِكَ فِيْ الأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ (المائدۃ ۳۲/۰۵)

''اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی، مگران کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے در پے کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقی (سزا کا مستحق) مسرف وہ ہے جو خون کے بدلے یا فساد فی الارض کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل نفس کا رتکاب کر کے احکامات الٰہی کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ لہٰذا بنی اسرائیل کی زیر نظر آیت میں مقتول کا قاتل، مقتول کے ''مظلوم'' ہونے کی وجہ سے مسرفین میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذکورہ وجوہات کے علاوہ کسی اور وجہ سے پہل کرتے ہوئے قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ مظلوم مقتول کے ولی کی پوزیشن اس سے کافی مختلف ہے، وہ اگر اسراف کا مرتکب ہوتا بھی ہے تو اولاً، پہل نہیں کرتا، دوم، خون کے بدلے میں اسراف کرتا ہے جس کے پیچھے بشری کم زوری چھپی ہوتی ہے نہ کہ حقیقی مسرف کے مانند احکاماتِ الٰہی کو چیلنج کرنے کی باغیانہ ذہنیت۔ اسی لیے محرکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، مسرف ہونے کی صورت میں اس کے لیے لچک کی گنجایش باقی رکھی گئی ہے۔

المختصر! بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳ سے واضح ہوتا ہے کہ مظلومانہ قتل کا واقعہ رونما ہونے کی صورت میں، مقتول کے ولی کے پاس بدلہ لینے کا، خدائی سند پر مبنی پورا جواز موجود ہوگا، یہ جواز اسے طاقت واختیار سے نوازے گا۔ خدائی سند اور سماجی منظوری کی حامل ایسی زبردست طاقت ملنے کے بعد ولی کو اسراف فی القتل کی آراستگی سے بچنا ہوگا کہ وہ آیاتِ الٰہی کے منکرین میں شمار ہوسکتا ہے۔ اگر وہ نہیں بچ پاتا تو معاشرے وریاست کو چاہیے کہ اس پر آیاتِ الٰہی کے منکر کا لیبل چسپاں نہ کریں اور اس کے عمل کو بشری کم زوری پر محمول کرتے ہوئے حکمت وتدبر سے کام لیں۔ (جاری)

ماہنامہ 'الشریعہ' کا نومبر ۲۰۰۸ کا شمارہ

''دہشت گردی، خودکش حملے اور اسلام کی حربی اخلاقیات''

کے عنوان پر خصوصی اشاعت کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ (ادارہ)

© rasailojaraid.com